⊙ ڈاکٹر سعید بھٹا

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ پنجابی، جی سی یونیورسٹی، لاہور

پنجابی کلاسیکی شاعری میں تانیثیت

Abstract:

Feminism is an approach to see, analyze and interpret text and world from female perspective. Punjab has been the land of diverse cultures and world views. In ancient times the society was maternal, which was transformed into paternal one by the Aryan invaders in a long series of wars and settlements. Despite this transformation and assimilation of Aryan world view, the Punjabi sensibility has strong imprints of maternal society. The folk tales and classical Punjabi poetry, surprisingly present the maternal point of view strongly. This article explores the themes of feminism in classical poetry and strong female characters of folktales in Punjabi.

Keywords:

Feminism Punjabi Poetry Classical Folk

پنجاب کی قدیم ثقافت کے بارے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں ہزاروں برس تک مادرسری نظام کا عروج رہا۔ تب ماں ہی قبیلے کی سربراہ ہوتی تھی اور زندگی کے سب معاملات اسی کے ہاتھ ہوتے تھے۔ وراثت کی مالک بیٹی ہوتی تھی۔ اولاد کو باپ کی بجائے ماں کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔ آریاؤں کی آمد سے ہمارے وسیب میں بڑی تبدیلیاں آئیں اور مادرسری نظام کی جگہ پدرسری نظام نے لے لی۔ یہ کوئی ایک آدھ دن کی بات نہیں بلکہ آریائی فکر کو یہاں قدم جمانے میں سیکڑوں برس لگے۔ اس طرح صدیوں کے سفر میں عورت زندگی کے مرکزی دھارے سے ہٹتی چلی گئی اور باپ نے بڑائی اور سرداری کی دستار اپنے سر رکھ لی۔ آریائی فکر نے برعظیم پہ دوسرا حملہ برہمنی تعبیروں کے ذریعے کیا۔ برہمنی تعبیر نے پوری ثقافت کو برہمن، کھشتری، ویش اور شودر میں تقسیم کیا۔ سب سے نچلا درجہ شودر تھا، جسے پاکیزگی اور رزالت کے معنوں میں ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ ان کا حال جانوروں سے بھی برا تھا اور ان کی عورتیں شودر مردوں کے سامنے ہیچ بنی ہوئی تھیں۔ برہمنی فکر میں عورت اور فریب ہم معنی بن گئے تھے۔ سنسکرت کی روایت نے اس فکر کو اس طرح پھیلایا کہ عورت صدیوں تک

اس بوجھ سے نہ نکل سکی۔

دوسری بات برعظیم کے ساتھ ساتھ پنجاب بھی اس شکنجے میں پھنسا رہا۔ پدرسری نظاموں کے نتیجے میں جاگیرداری اور بادشاہت وجود میں آئے۔ اب مردانہ پن بہادری، شجاعت، سخاوت، طاقت اور غرور کی علامت بن گیا جبکہ نسائیت کو فریب کی علامت مان لیا گیا۔ پنجابی ثقافت میں بھی قبائلی سرداروں اور جاگیرداروں کو یہی فکر خوش آئی، مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ پنجابی کا کلاسیکی ادب اس فکر کی نفی کرتا ہے اور اس ادبی روایت کا سرا مادری نظام سے جڑا ہے۔ ہم پنجابی کی کلاسیکی روایت کو بڑی آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: پنجابی کی رومانوی داستانیں اور صوفیانہ شاعری۔

پنجاب کی نمایاں داستانیں ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال اور مرزا صاحباں کو سیکڑوں شاعروں نے نظم کیا ہے۔ قریب ہر شاعر کی شاعرانہ فن کاری اور اوصاف منفرد ہیں جو اسے دیگر شعرا سے ممتاز کرتے ہیں، لیکن ان داستانوں میں مشترک نکتہ انسانی آزادی ہے۔ سسی پنوں کی کہانی میں ایسی ان ہونی رونما ہوتی ہے جو انسانی روح کو کپکپا دیتی ہے۔ سسی ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی اور اس کے حسن کا بھونرا، اس کے سردار باپ جام آدم کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ وہ یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ اس کی بیٹی کی شہرت ہو اور اس کی دستار میں داغ لگ جائے۔ بے گناہ پیدا ہوئی سسی کو دریا میں بہا دیا جاتا ہے۔ وہ دھوبی کے گھر میں پرورش پاتی ہے۔ جب باپ اسے پہچان لیتا ہے کہ یہ میری بیٹی ہے تو شاہی انا بیدار ہو جاتی ہے اور اسے شاہی باغ میں محل بنوا کر دیا جاتا ہے۔ یہیں اسے پنوں سے عشق ہو جاتا ہے۔ پنوں کو اس کے بھائی مدہوشی کے عالم باندھ کر اپنے ساتھ کیچ لے جاتے ہیں اور سسی تھل کی تپتی ریت میں جان دے کر عشق کا پرچم بلند کر جاتی ہے۔

سوہنی، اتے کمھار کی بیٹی اور بے انتہا سوہنی ہے۔ وسط ایشیائی سوداگر مرزا عزت بیگ کو اس سے عشق ہو جاتا ہے۔ عزت بیگ، اتے کے ہاتھ سے بنے برتنوں کو مہنگے داموں خرید کر سستے بیچتا ہے اور یوں بالکل کنگال ہو جاتا ہے۔ اتے کو اس پہ ترس آ جاتا ہے اور وہ اسے ملازم رکھ لیتا ہے۔ عزت بیگ کے خاندان کی شان اور دولت کی آن کو ایک طرف رکھنے پہ سوہنی بھی نہال ہو جاتی ہے۔ رات کو گھڑے پہ دریا پار کر کے مہینوال سے ملنے جاتی ہے جس کی خبر اس کی نند کو ہو جاتی ہے۔ ایک رات وہ پکے کی جگہ پہ کچا گھڑا رکھ دیتی ہے۔ کچا گھڑا پانی میں گھل جاتا ہے اور لہریں لیتے دریا کے سامنے سوہنی جان کی بازی ہار جاتی ہے۔ مہینوال ڈوبتی سوہنی کے ساتھ ہی دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے اور دونوں کا عشق امر ہو جاتا ہے۔

مرزا لڑکپن میں کھیوے کی طرف جا کر پڑھتا ہے اور وہیں صاحباں کو دل دے بیٹھتا ہے۔ صاحباں کی شادی چدھڑوں کی طرف کرنے کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ صاحباں پیغام بھیجتی ہے اور مرزا اسے گھوڑی پہ نکال لے جاتا ہے۔ ابھی راستے میں ہی ہوتے ہیں کہ ماہنیوں کا پیچھا کرتا گروہ ان کو آلیتا ہے اور دونوں کو قتل کر ڈالتا ہے۔ یوں دونوں جان کا نذرانہ دے کر ہمارے اجتماعی حافظے کا حصہ بن جاتی ہے۔

ہیر کی کہانی عشق و وفا کا بہترین پیکر ہے۔ دھید ورانجھا، تخت ہزارے کا رہنے والا اور زمیندار گھرانے کا پوت ہے۔ وہ گھر والوں کے رویے سے تنگ جھنگ آ نکلتا ہے جہاں اس کی ملاقات ہیر سے ہوتی ہے اور رانجھا سیالوں کا مہینوال بن جاتا ہے۔ ہیر کی شادی کھیڑے کے ساتھ کر دی جاتی ہے اور رانجھا جوگی بن کے رنگ پور جا پہنچتا ہے۔ وہ ہیر کو وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ جھنگ پہنچتے ہیں اور وہاں ہیر کے گھر والے اسے برأت کی تیاری کا کہہ کے دھوکے سے زہر دے دیتے

ہیں اور یہ خبر سن کے رانجھا بھی جان دے دیتا ہے۔

ان داستانوں کی ڈور سورمیوں کے ہاتھ میں ہی ہے اور ان کی ہستیاں ہی فیصلہ کن ہیں۔اس فراق زدہ عشق کی تکمیل وسیب کے لیے شرمساری کا سامان لیے ہوئے ہے۔ایک طرف انسانیت اور سچے انسان کی ہستی کا سوال ہے اور دوسری طرف شکایت، کوسنے، تکبر، عزت، قانون، شریعت اور ثقافت کی جکڑ بندی ہے۔یہ بہادر خواتین ہزاروں برس کے غیر انسانی نظام کو محض چیلنج ہی نہیں کرتیں بلکہ اس کے چہرے سے منافقت کا پردہ بھی چاک کرتی ہیں۔ہیر رانجھا کی کہانی اس ضمن میں فریب ساز قوتوں کو بے نقاب کرتی ہے۔سسی، سوہنی اور صاحباں میں بھی عورت نے ان انسان مخالف قوتوں کا پردہ چاک کیا ہے مگر ہیر کی کہانی میں مردانہ سماج اور نسوانی حقوق کے تصادم کا ہلکا سا جائزہ دکھا کر جاگیرداروں، ملاؤں، قاضیوں اور کیدوؤں کے بارے میں کوئی ابہام چھوڑا نہیں گیا۔رانجھا تخت ہزارے کی بے انصاف ثقافت سے گریزاں جھنگ آتا ہے۔ ہیر سے ملنے کے بعد دونوں انسان کی آزادی کی بات کرتے ہیں۔وہ سماجی دباؤ کا وزن سر سے اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان بہادر خواتین کی داستانوں میں وہ جوہر اور جادو موجود ہے جو نئی نسلوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

پنجابی کی صوفیانہ شاعری میں ہیر رانجھا، سسی پنوں اور سوہنی مہینوال کی علامتوں کو بے انتہا برتا گیا ہے۔ان شاعروں نے داستانوں کے کرداروں کی مدد سے اپنے دل کی کیفیتوں کو بڑی باریکی سے بیان کیا ہے اور یوں محبت کے ان مول جذبات کو کئی رنگوں میں دکھایا ہے۔رومانوی داستانوں سے ہٹ کر بھی یہاں عورت نئی ہستی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ پنجابی شاعری کا بانی بابا فرید کو تسلیم کیا جاتا ہے، جو پنجابی کے پہلے باقاعدہ شاعر تھے۔ان کا خاندانی پس منظر تو فارسی ہے جو پدرسری ثقافت کی زبان ہے۔دل چسپ بات یہ ہے کہ ان کے ہاں بھی نسوانی رنگ میں جذبات کے اظہار کی کئی مثالیں مل جاتی ہیں۔انھوں نے جو نقوش ترتیب دیے وہ پوری شرح وبسط سے خواجہ فرید تک نظر آتے ہیں۔ہمارے تجزیے میں تو ان کی پنجابی شاعری کے عقب میں پنجابی لوک ادب کی ہزاروں برس کی روایت کام کر رہی ہے اور ان کی شاعری میں نسوانی صیغے میں کلام کرنے کا یہ اسلوب اسی روایت سے ان تک پہنچا ہے۔

اج نہ سُتی کنت سیوں، انگ مڑیں مُڑ جاءِ
جاءِ پُچھو ڈوہاگنی، تم کیو رین وِہاءِ(۱)

بابا گورو نانک اس حوالے سے بڑے اہم شاعر ہیں کہ جن کی شاعری تحریری صورت میں محفوظ کی گئی ہے۔ان کی تحریر کے طفیل پنجابی کا بڑا ادبی ورثہ محفوظ ہو گیا ہے۔وہ کئی ادبی اصناف کے بانی ہیں۔نسوانی لہجے میں کلام کرنے کا انداز ان کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔وہ عورت کی نہایت قابلِ احترام ہستی مانتے ہیں، جس کے ذریعے انسانی سماج، رشتوں اور نسلوں کو بقا ہے۔وہ مرد کو پیدا کرتی ہے، پالتی اور اس کی پرورش کرتی ہے اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والا ہی اسے برا بھلا کہتا ہے:

بھنڈ جمی اے بھنڈ نمی اے بھنڈ منگن ویاہُ
بھنڈوہ ہووے دوستی بھنڈوہ چلے راہُ
بھنڈ مُوآ بھنڈ بھالیے بھنڈ ہووے بندھانُ

سو کیوں مندا آکھیے جت جمہ راجانْ(۲)

شاہ حسین، سلطان باہو، بلھے شاہ اور خواجہ فرید کے ہاں گھریلو عورت کا کھلا ڈلا روپ نظر آتا ہے۔ یہ عورت پیکوں کے ہاں ہوتے ہوئے بھی سسرال جانے کی تیاریاں کر رہی ہے اور اس پہ ہمیشہ ایک ان دیکھا خوف تاری رہتا ہے۔ اس کے سگے، ساس، نند اور سسرا سے دکھی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ اسے بس ماں کا ہی سہارا ہے، جس کی نصیحتیں اور جھڑکیاں آنے والے وقت کا ہول جگائے رکھتی ہیں۔ اسے گھر پہ ہی چرخا کاتنے کے دوران بیدار مغز جیون کا راستہ دکھاتی ہیں۔ یہ روئی کے گولے بناتی، سوت کاتتی، نلی باٹتی، انٹی تیار کرتی چرخے سے چھلیاں اتارتی، تانا بنتی اور سوئی دھاگے تک کی نک سک سنوارنے کی کوشش میں ہے۔ یہ ادھار کا لین دین بھی کرتی ہے اور بیوپاریوں سے حساب کتاب کا بھی سوچتی ہے۔ یہاں کچھ مثالیں دیکھیے:

انی جِند مینڈڑیے، تیرا نلیاں دا وقت وِہانا
راتیں کتیں، دیہنیں اٹیریں، گوشے لائیں تانا(۳)

چرینڈی آئی لیلڑے، تُمینڈی اُن کڑے
اُچی گھاٹی چڑھدیاں، کُنڈے پیر پُڑے(۴)

دودھ دہی تاں ہر کوئی رِڑکے، عاشق بھاہ رِڑکیندے ہو
تن چٹورا من ،مدھانی، آہیں نال ہلیندے ہو
دُکھ توں نیترا چیکاں مارے، غم دا پانی پیندے ہو
نام فقیراں تنھاں دا باہو، ہڈیوں مکھن کڈھیندے ہو(۵)

جے داج وہونی جاویں گی
تاں کسے بھلی نہ بھاویں گی
توں شوہ نوں کیویوں ریجھاویں گی
کُجھ لے فقیراں دی مت کُڑے
کت کُڑے نہ وت کُڑے
چھلی لاہ بھروٹے گھت کُڑے(۶)

میں کُسنڑا چُگ چُگ ہاری
میں کُسنڑا چُگ چُگ ہاری

ایس گُسنبے دے کنڈے بھلیرے اڑ اڑ چُنڑی پاڑی
ایس گُسنبے دا حاکم کرڑا، ظالم ہے پٹواری (۷)

نی کوہجپل میرا ناں
سوہرے سانوں وڑن نہ دیندے
نانک دادک گھروں کڈھیندے
میرا پیکا نہیوں تھاں (۸)

خواجہ فرید کے ہاں نچلے طبقے کی یہ عورت پیلوں چن چن کر اپنا پیٹ پالتی ہے۔ یہ بھیڑ بکریاں بھی چراتی ہے اور دن کے وقت مٹکا بلو کے گھر بار لیپتی پوتتی بھی ہے۔

وچ روہی دے رہندیاں
نازک ناز جٹیاں
راتیں کرن شکار دلیں دے
ڈینہاں ولوڑن مٹیاں (۹)

کئی ڈیون ان نال برابر
کئی گھن آون ڈیڈھے کر کر
کئی وتچن بازار
ٹلیاں تکیاں نی وے
آ چُنوں رل یار
پیلوں پکیاں نی وے (۱۰)

کلاسیکی شاعری میں عورت کی اور بڑی علامت جوگن ہے، جو معاشرت کی اصل ہستی اور اس کی منافقتوں کی واقفِ حال ہو کر انھیں ترک کیے بیٹھی ہے۔ وہ ازل سے بیراگن ہے اور اس معاشرت سے ابھرنے والے فریبوں سے بے زار ہے۔ اس کی کمائی فراق ہے۔ فراق میں ہی اس نے لٹین کھول کے گلے میں ڈال لی ہیں۔ جنگل بیلوں میں اپنے پریتم کو تلاش کرتی پھرتی ہے۔ وہ گھریلو خاتون کی طرح جہیز کی فکر میں نہیں گھل رہی بلکہ اسے دردر کی خاک چھاننے سے سکون ملتا ہے۔

لٹاں کھول کے گلے وچ پائیاں، میں بیراگن آد دی وو
جنگل بیلے پھراں ڈھونڈیندی، کوکاں نہ ماری لاج دی وو (۱۱)

گل مِرگانی سیس کھپریا
بھیکھ منگن نوں در در پھریا
جوگن نام بھیا، لِٹ دھریا
انگ بھبھوت رُمایئو رے
اب کیوں ساجن چِر لائیو رے(۱۲)

تتی تھی جوگن چودھار پھراں
ہند سندھ، پنجاب تے ماڑ پھراں
سُنج بار تے شہر بازار پھراں
متاں یار مِلم کہیں سانگ سبب(۱۳)

ہم پہلے یہ بات کر چکے ہیں کہ آریائی فکر نے مادرسری نظام کو ختم کر کے یہاں پدرسری ثقافت تشکیل دی۔ان کی طبقاتی تقسیم میں سب سے نچلے درجے میں شودر ہے۔پنجاب میں سب سے نکمے خاندان کو چُو ہڑا کہا گیا ہے۔چُو ہڑی کو سماج کی گندگی صاف کرنے کی سیپ ادا کی گئی ہے۔اس کی چھجلی جھاڑو کراہت کا نشان بن گئی ہے۔اس کے نکالے ہوئے خس اور گندم کا ڈھیر آدم زادوں کی کمزوری ہیں۔گندم کے اسی دانے کی وجہ سے ہی تو آدم وحوا کو جنت سے نکالا گیا۔اس بدصورت اور گئی گزری سیپن کو پنجاب کے صوفیوں نے سینے سے لگایا اور خود کو چوہڑی کے نام سے پہچانا۔

چوہڑی ہاں دربار دی
دھیان دی چھجلی، گیان دا جھاڑو، کام کرودھ نت جھاڑی (۱۴)

میں چوہڑی ہاں سچے صاحب دے درباروں
پیروں ننگی سِروں جھنڈولی سنیہا آیا پاروں(۱۵)

گرم گوہا تے نرم چوہڑیٹی سر برہوں چھج چکائے
سوڑیاں گلیاں لگدے دھکے ماں نہ ویکھن آئے
اُچیاں کڑیاں نیویں دروازے اساں پلھ پلھ حال ونجائے(۱۶)

پدرسری بولی سنسکرت میں صرف اونچے طبقے کی عورت نظر آتی ہے۔وہ بھی اپنے پریمی سے پریم کرتی ہے۔وہ بھوگ کے لیے اتاولی ہے اور یار سے سابق ملنی کے سبب اس کا وجود دہک رہا ہے۔کبھی کبھی بے بس ہو کر پچھلے بھوگ کے اشارے بھی کر رہی ہے۔اس کے برعکس پنجابی کی کلاسیکی شعری روایت کی ہیر اور سسی اعلیٰ طبقے کو تج کر فراق اور عشق کی راہ اپناتی ہیں۔وہ ثقافت کے جبر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔یہاں گھریلو عورت بھی نچلے طبقے کی ہے جو کام کاج میں

مصروف ہے۔ جوگن نے تو بے خود ہو کر لٹیں کھول گلے میں ڈال لی ہیں اور جنگل بیلے اور تنہائی میں ماہی کو تلاشتی پھرتی ہے۔ یہاں چوہڑی کے جذبوں کو بھی زبان ملتی ہے اور طبقاتی تقسیم کی فکر سے نفور بھی ملتا ہے۔ پنجابی کی کلاسیکی شاعری میں عورت پوری قوت سے سامنے آتی ہے اور مرد کردار ان بہادروں کے سامنے بہت چھوٹے لگتے ہیں۔

پنجاب کی دھرتی ایسی ہے جہاں قدم قدم پہ شاعر مل جاتا ہے اور یہ شاعری جگ کی قیمت عشق بتاتی ہے۔ اس میدانِ عشق میں عورت کا کردار بہت صابر ہے۔ یوں عورت کلاسیکی شاعری کا موضوع تو بن جاتی ہے تاہم نسوانی تحریر یہاں بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ کچھ محققوں نے اٹھارویں صدی کی شاعرات سچو بائی اور دَیا بائی کے نام گنوائے ہیں اور ان کے بعد انیسویں صدی میں صاحب دیوی اُروڑی، پھاپھل حفظانی، جیون خاتون نکمی، عائشہ بی بی اور بی بی مخفی جیسے نام سامنے آتے ہیں۔ اس دور کی شاعرات میں صرف پیرو پریمن (۱۸۲۰ء۔۱۸۷۰ء) ہی ہے جس نے منفرد رنگ میں شاعری کی ہے۔ اور اس کی آواز میں عورت کے گہرے درد کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ اپنے بارے میں لکھتی ہے:

پیرو سائیں میں ملا، گلاب داس فقیر
ہندواں گورو جانیے، مسلمان دا پیر
سوہج سم پرکاشیا، سو ستگُر میرا
جان کوئی نہ سکدا، اگیان ہنیرا(۱۷)

پنجابی کلاسیکی شاعری میں عورت کی روح ہمیشہ شوہ، خصم، پتی، کنت، شام، جوگی، ماہی اور نوشہ کے لیے تڑپتی رہتی ہے۔ اس کو اطمینان تبھی ہو سکتا ہے جب وہ پیارے میں رچ بس جائے۔ وہ رانجھا رانجھا کرتی رانجھا تو بن جاتی ہے مگر کہیں بھی ہیر ہیر کہتی ہیر نہیں بنتی۔ کلاسیکی شاعری میں معانی کی ایک سمت مابعد الطبیعاتی بھی ہوتی ہے جس میں حقیقت نر ہے اور ناری اس سچ تک پہنچنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ بھلے ہی ہمارے مفسرین خدا کو مذکر مونث میں تقسیم کرنے کے حق میں نہیں مگر زبان کی ساخت ایسی فکر کا ساتھ نہیں دیتی۔ بولی انسان کی تقسیم تذکیر و تانیث میں ہی کرتی ہے۔ زبان کی ساخت کو ثقافت کے سیاق میں دیکھیں یا دماغی ساخت کے حوالے سے اس پہ نظر کریں، دونوں صورتوں میں زبان کی ساخت کو انسانی سوچ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے بڑے شاعروں نے بھی عورت کو عزت و تکریم دینے کوئی کمی نہیں کی اور ان کے ہاں نسوانی تکریم کی بے نظیر مثالیں مل جاتی ہیں، لیکن ایسا پھر بھی نہیں ہوا کہ کسی شاعر نے مکمل طور پہ نسوانی روپ اختیار کر لیا ہو اور یہ پہچاننا مشکل ہو جائے کہ وہ نر ہے یا ناری۔ عورت کے اسلوب میں کلام کرنے والا سب سے نمایاں شاعر شاہ حسین ہے مگر وہ بھی ''فقیر نمانا'' ہی رہتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بابافرید، آکھیا بابا فرید نے، (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۷۸ء)، مرتبہ: محمد آصف خاں، ص ۱۰۳

۲۔ بابانانک، کلام نانك بمعه فرهنگ، (پٹیالہ: بھاشاوبھاگ پنجاب، ۱۹۷۱ء)، مرتبہ: ڈاکٹر جیت سنگھ سیتل، ص ۴۳۵

۳۔ شاہ حسین، کافیاں شاہ حسین، (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۲۰۱۴ء)، مرتبہ: محمد آصف خاں، ص ۱۸۳

۴۔ ایضاً، ص ۵۰

۵۔ سلطان باہو، ھُو دے بیت، (لاہور: سانجھ، ۲۰۰۷ء)، مرتبہ: ممتاز بلوچ، ص ۲۲۵

۶۔ بلھے شاہ، آکھیا بلھے شاہ نے، (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1992ء)، مرتبہ: محمد آصف خاں، ص ۲۳۸

۷۔ ایضاً، ص ۳۴۵

۸۔ ایضاً، ص ۳۵۰

۹۔ خواجہ فرید، آکھیا خواجه فرید نے، (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۹۴ء)، مرتبہ: محمد آصف خاں، ص ۲۵۱

۱۰۔ ایضاً، ۲۹۹

۱۱۔ کافیاں شاہ حسین، ص ۶۱

۱۲۔ آکھیا بلھے شاہ نے، ص ۵۹

۱۳۔ آکھیا خواجه فرید نے، ص ۷۳

۱۴۔ کافیاں شاہ حسین، ص ۱۴۵

۱۵۔ آکھیا بلھے شاہ نے، ص ۳۴۳

۱۶۔ سیدوارث شاہ، اصلی وڈی هیر، (لاہور: عمر بک سنٹر، س، ن)، مرتبہ: پیراں دتہ، ص ۳۶۴

۱۷۔ چرن جیت کور، ناری دِرشٹی (لدھیانہ: پنجابی ساہت اکاڈمی، س، ن)، ص ۱۳۰